ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی
(ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
محمد صفدر رضیائی
(سکالر ایم-فل اردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

"ماسوا" کی نظمیں اور سلیم شہزاد کا علامتی بیانیہ

Abstract:

Saleem Shahzad is a well-known poet of Modern Urdu Poem. He has introduced a new symbolic narrative. His poetry reflects the true image of contemporary society. These subjects cover the internal affairs of human being and his life. This research Paper "Ma Siwa ki Nazmen aur Saleem Shahzad ka Alamti Byania" Present the Critical view about the poems and diction of the poet.

کلیدی الفاظ۔ سلیم شہزاد، ماسوا، حسرت موہانہ، انتظار حسین، بہاول نگر

سلیم شہزاد کی تخلیقی شخصیت کا بنیادی حوالہ شاعری ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے جس صنف کو اختیار کیا ہے وہ نظم ہے۔ اُن کی نظم جدید اردو نظم کے اس بنیادی دھارے کا حصہ ہے جس کا جائزہ گذشتہ باب میں لیا جا چکا ہے۔ اس باب میں ہم سلیم شہزاد کی نظم کے باطن میں موجود فکری ور فنی اوصاف کا بالتفصیل جائزہ لیں گے۔ نظم کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بناتے ہوئے اب تک ان کے دو مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ سلیم شہزاد کی نظمیں ماورائی اور مافوق الادراک تخیلات کے باعث قاری کے الجھانے کی بجائے اپنے خاص اسلوبیاتی رنگ کی بنا پر گہرا استدلال مہیا کرتی ہیں جس کا تانا بانا اس کے اپنے گردونواح میں موجود حالات و واقعات سے بنا ہوتا ہے۔ وہ ان دیکھی کائناتوں کی سیر کرانے کی بجائے اپنی نظم میں حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کم و بیش ان کی سبھی نظموں کا خاصا ہے۔ سلیم شہزاد اپنی نظم "شاعری اوڑھنی نہیں" کے دوسرے حصے میں حقائق کو واضح کرتے ہوئے شاعر سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ احساس اور مشاہدہ کی اس اپج پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ شاعری کو زندگی کا جزوِ لازم اور جزوِ لاینفک خیال کرنے لگتا ہے تبھی تو وہ یہ کہتا ہے:

شاعری صحرا ہے جو
منزل بھلا دیتی ہے
(شاعری) ہوا ہے
جو منظر اڑا دیتی ہے

شاعری جسموں کے

طشت گنوا دیتی ہے(۱)

سلیم شہزاد کی نظم روایت کے انداز سے اس وجہ سے بھی صرف نظر کرتی ہے کہ ان کا خیال کسی ان دیکھی دنیا کے تجربات اور مشاہدات کا نظارہ پیش کرتا ہے لیکن ان کا اصل کمال تو یہ ہے کہ وہ تمام تر مشاہدات اور مناظر کے باوجود اپنی حقیقی دنیا کا تصور اعلیٰ وارفع خیال کرتے ہیں۔ شاعر کا تخیل اسے ان عوالم سے بہرہ ور کرتا ہے جن تک عام ناظرین کی چشم کشائی ممکن نہیں ہوتی' وہ چاہے تو شاعری کا ماخذ وما حصل ماورائی کائناتوں کی سیر کے احوال کی شکل میں پیش کر سکتا ہے لیکن سلیم شہزاد کا یہی وصف انہیں دیگر شعرائے نظم وغزل میں ممیز کرتا ہے کہ وہ اپنی دنیا کے ساتھ والہانہ وابستگی کا ثبوت اپنے اشعار اور نظموں کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ سلیم شہزاد کی نظم "شاعری اوڑھنی نہیں' کے حوالے سے صلاح الدین نے لکھا ہے:

"سلیم شہزاد ہمیں خبر دار کرتا ہے کہ شاعری اوڑھنی نہیں بلکہ صحرا ہے جو منزل بھلا دیتی ہے
سلیم شہزاد کی شعری صورتیں انسانی رد عمل کے ناتے زندگی اور معاشرے کی غیر منطقی
صورتحال کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔"(۲)

سلیم شہزاد کی نظم "تمہی نے کہا تھا" میں شاعری کا رومانوی وروایتی انداز اور استعاراتی نظام موجود ہے جو جدید اردو نظم کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی شاعری سے احساسِ ذات کا تصور ابھرتا ہے۔ وہ اپنی ہی کھوج کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ہونے کی دلیلیں اکٹھی کرنے میں سرگرداں ہیں۔ جہاں وہ ثبوت وبراہین کے دیگر حربوں سے استفادہ کرتے ہیں وہاں ایک ذریعہ ماضی میں غوطہ زنی بھی ہے جہاں وہ اپنی یادوں کو بطور حربہ استعمال کرکے ان سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں جو ان کے دل ودماغ یا تحت الشعور کے کسی کونے کھدرے میں موجود ہیں اور ہمیشہ جواب طلبی کے لیے شاعر کو اکساتے رہتے ہیں۔ کسی ایسی شخصیت سے کیے گئے مکالمے جو انہیں احساسِ ذات کا میلان عطا کرتے ہیں ان کی نظم میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

تمہی نے کہا تھا
کہ اجاڑ شہر کی آباد دکانوں پہ
برباد مکینوں کے خالی اشتہاروں پہ
گمنام ناموں میں_ ایک نام_ تمہارا بھی ہے
تمہی نے کہا تھا کہ تنہائی کے سالن سے بساند آنے لگتی ہے
تو تم بہت یاد آتے ہو! (۳)

اس ضمن میں ڈاکٹر مزمل حسین رقم طراز ہیں:

> ”سلیم شہزاد نے شعریت اور لطافت سے مملو اپنے اسلوب میں اپنے وسیب کا مقدمہ پیش کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اب قوموں کی آزادی ”شعر“ کے ذریعے ہی جیتی جا سکتی ہے۔ سرائیکی وسیب کا یہ باشعور شاعر اپنے قومی دکھوں اور المیوں پر گہری نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں کہیں بیانیہ اور کہیں استعاراتی زبان میں اس ساری کرب انگیز تصویر کو سامنے لاتا ہے۔“(۴)

سلیم شہزاد اپنی شاعری میں جہاں دیگر موضوعات کو جگہ دیتے ہیں معاشرے کی کج رویوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ وہ جہاں پر معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہیں اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اِسی معاشرے کا حصہ ہے اور جن عوامل سے وہ ذاتی طور پر تنفر ظاہر کرتے ہیں انہی کے ساتھ نباہ کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

مجھے خوشبو سے بساند آتی ہے
میں بو پہن لیتا ہوں
اور درد کے چابک سے
وقت کو پیٹتا ہوں(۵)

جب شاعر معاشرے پر تنقیدی حوالے سے غائر نظر کرتے ہیں تو سامنے آنے والی کج رویوں کی بدولت حیرانی کے اس بحر عمیق میں جاڈوبتے ہیں جو انہیں اپنے محاسبے کی طرف لے چلتا ہے۔ ارسطو کے مطابق انسان معاشرتی حیوان ہے' اسے ہر صورت میں معاشرے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے' یہ اس کے سماجی رشتے کی پابندی ہے کہ اسے ناپسندیدگی کے باوجود اس معاشرے کے ساتھ معاملات کرنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ اسی معاشرے کے ساتھ معاملات نہیں کرتا اور سماجی بائیکاٹ کے ذریعے الگ تھلگ اپنی پہچان بنانا چاہتا ہے تو یا وہ فرشتہ ہے یا کوئی جن۔ وہ معاملات ضروریاتِ انسانی بھی ہو سکتے ہیں' اور کچھ عقلی و قلبی رشتوں کا تقدس اور مجبوریاں بھی۔ جب ان مجبوریوں اور پابندیوں سے اکتفا کرنا پڑتا ہے تو انسان لاتعلقی کے ساتھ جینا شروع کرتا ہے' بقول سلیم شہزاد:

حیرانی کی منڈیریں
مجھ سے اونچی ہو گئی ہیں
میں لاتعلقی کے کٹہرے میں کھڑا
شناسائی کی گواہی کا منکر
لفظوں کے ہیر پھیر سے
بندھا
زمانے کا بیان مانگتا ہوں(۶)

سلیم شہزاد معاشرے کی برائیوں اور حد درجہ بڑھتی ہوئی کج رویوں کو دیکھ کر اس وجہ سے بھی حیرانی کا شکار ہیں کہ انسانوں کو خود کے نفع و نقصان کی کوئی پرواہ نہیں اور وہ وہ برابر وہی کچھ کیے جا رہے ہیں جو ان کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس امر پر بھی متفکر ہیں کہ وہ خود اس کے ساتھ شامل ہیں اور بصد کوشش کچھ نہیں کر پاتے بلکہ ان کے حامی بننے پر مجبور ہیں۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بدولت سلیم شہزاد شناسائی کی گواہی کا منکر بن جاتا ہے اور لفظوں کی ہیر پھیر سے بندھا ہوا زمانے کی زبان کشائی کے انتظار میں ہے تا کہ وہ بھی انہی کا ہم پلہ ہو کر قدم بڑھائے۔ سلیم شہزاد کی نظم میں متنوع موضوعات پر بحث کرتے ہوئے صلاح الدین حیدر لکھتے ہیں:

> ”اس شاعری میں الفاظ کے رنگوں میں موسیقیت بھی ملتی ہے اور کہیں بے باک انداز سے ناتوانی کے سرگزشت۔ بعض اوقات نظم سوالیہ بن جاتی ہے۔“(۷)

سلیم شہزاد کی نظم نگاری زندگی کے ان حقائق کی عکاسی کرتی ہے جن کو عموماً لایعنی سمجھ کر صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ان معمولات کو موضوع بناتے ہیں جو اس کی جبلت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انسان اپنے ماحول اور مسکن سے اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ اسے اس کی پریشانیوں میں بھی عجیب طرح کا سکون اور اپنائیت کا احساس بہر حال رہتا ہے حالانکہ ممکن ہے کسی بیرونی آنکھ سے دیکھنے پر کتنا ہی بھیانک اور دلخراش نظارہ ہی کیوں نہ پیش کرے۔

> "Salim Shahzad has a deep rooted love for Punjab language, culture and literature; but his poetry can attract the wisdom anywhere and the world."(8)

سلیم شہزاد اس ماحول اور اس کی مجبوریوں کا عادی ہو چکا ہے جب کہ اس کے حالات پر برملا طور پر نوحہ کناں بھی ہے لیکن اس کی وابستگی یا محبت ہے جو اسے اس ماحول سے علاحدگی پر آمادگی نہیں بخشتی۔ وہ جہاں رہتا ہے اس کو اپنے لیے ایک عظیم نعمت خیال کرتا ہے لیکن برعکس اس کے ' اس کے ذہن کسی حصے میں عدم سلامتی اور عدم تحفظ کے خدشات بھی کار فرما ہیں جس کی بنا پر خفیف سی بغاوت سر اٹھانے لگتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ فوج کو بطور علامت استعمال میں کر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو اس شہر کے محافظ اور نگہبان ٹھہرے تھے وہ بھی اب اس کے موجودہ حالات اور ماحول کی ناسازگاری سے بغاوت کرتے ہوئے معلوم پڑتے ہیں۔ سلیم شہزاد کی نظموں میں پائی جانے والی استعاراتی فضا کی تفہیم کا ذریعہ بھی بقول فاروق ندیم انہی کے مصرعوں ہی میں مضمر ہے۔

> ”سلیم شہزاد کی کتاب ”ماسوا“ میں شامل نظمیں فرد کے داخلی دکھ اور خارجی عوامل کے جبر سے عبارت ہیں۔ اس کی نظموں کا ہر مصرع کسی کلیدی کنجی کی طرح ہے۔ انہی کے گچھے سے اسم اعظم کا وہ تالا کھلتا ہے جو مخفی معنی تک سرایت کرنے میں مدد دیتا ہے۔“(۹)

اس ضمن میں نظم کا اگلا حصہ ملاحظہ ہو:

شہر پناہ بھی اب تو وسوسوں کی دھن میں لپٹی رہتی ہے
شہر پناہ میں رہنے والے' باغی چاند کی اترن کو اپنا زیور کہتے ہیں
شہر پناہ کے باہر اب بھی غربت روتی پھرتی ہے' شہر پنہ کی فوج
بھی اب تو مجھ کو باغی لگتی ہے_ شہر پنہ سے بھاگے جب بھی (۱۰)

انسانی سرشت میں شامل ہے کہ وہ کبھی بھی ایک طرح کے حالات کو تادیر قبول کرنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا اور اس کی یہی عدم رضامندی ہی اس کی طبیعت کا تغیر ہے جو اسے بالآخر بغاوت میں بدل دیتا ہے اور اس کی سوچوں اور فکر کی بالیدگی میں پلنے والا خیال حقیقت کے قالب میں ڈھلنے کے لیے تحرک کی سطح تک آپہنچتا ہے۔ سلیم شہزاد کی نظم ن م راشد اور میراجی کی جدید نظم نگاری کی جدید ترین شکل ہے۔ ان کی نظم میں جہاں فکری معنویت اہمیت کی حامل ہے وہیں ان کا انداز بھی خاص ہے' انتظار حسین ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ جدید شاعری' جس نے میراجی سے آغاز کیا تھا' بہاول نگر پہنچ کر کتنی زیادہ جدید بن چکی ہے۔ اب تو وہ کاغذ پر بھی کچھ لہریا کی صورت لکھی نظر آتی ہے۔''(۱۱)

سلیم شہزاد اپنے مسکن کی تمام مشکلات اور مسائل کو کھلے دل سے سہتے اور قبول کرتے ہوئے امید کی ایک ایسی کرن لیے بیٹھے ہیں جو انہیں تابندہ مستقبل کی نوید سناتی ہے۔ وہ اس امر کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ ہر مشکل کے بعد آسانی اور ہر پریشانی کے بعد اس کا حل سامنے آہی جاتا ہے' گویا وہ چشمِ تخیل سے غلامی کی زنجیروں کو ٹوٹتا اور شہر پناہ کے راستوں میں آزادی کی چُنری کو لہراتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ نظم کا حصہ ملاحظہ ہو:

رستوں کی زنجیریں تم کو' پاگل کر کے چھوڑیں گی
بندی ہو' آزادی ہو' سوچ کی بہری وادی ہو' تم کو آخر
شہر پنہ میں رہنا ہو گا۔۔۔ دیکھ رہے ہو؟
شہر پنہ کے سارے راستے' آزادی کی چنری تھامے
شہر پنہ میں بھاگ رہے ہیں! (۱۲)

تخلیق کار کی تخلیق چاہے وہ کسی بھی صنفِ ادب سے متعلق ہو' کسی نہ کسی تحرک یا خاص مقصد کا پیش خیمہ ہوتی ہے' یا پھر کسی جذبہ یا تحریک کے باعث اس کا جوابی وجود عمل میں آتا ہے۔ زیرِ تجزیہ نظم میں شاعر کا شعور بڑی حد تک اس کے ماحصل میں کار فرما نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے ایک مکمل پس منظر موجود ہے جس میں سلیم شہزاد کی زندگی کو بطورِ خاص بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ کسی ایسی جہدِ مسلسل کے بعد کسی نتیجہ پر نہ پہنچتے ہوئے

اپنامتاعِ لاحاصل واپس لیناچاہتے ہیں جو اصل میں ان کی اپنی کاوش اور کوشش کے سوا کچھ اور نہیں ہے جو انہوں نے حصولِ مقصد کے لیے تاوقتِ تحریر صرف کی ہے۔ سلیم شہزاد کی نظموں میں بیان کی جانے والی حقیقتیں اس کرب کی نشاندہی کرتی ہیں جس کا ذکر فاروق ندیم نے کیاہے:

"سلیم شہزاد کے شعری مجموعے "ماسوا" میں شامل نظمیں اپنے عہد کے کرب کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کا نویلا تخلیقی ڈھب اپنے عہد کی حقیقتوں کو بیان کرنے کے لیے نئے انداز اپناتا ہے۔"(۱۳)

بنیادی طور پر وہ اپنی کی گئی کوششوں سے مایوسی کی حد تک ناامید نظر آتے ہیں اور یہی وہ امر ہے جو براہ راست ان کی زندگی سے انسلاک رکھتاہے' خاص طور پر ایسی حالت میں جب وہ روشن صبح کو اس کے اصل رنگ و تابانی کی بجائے رات کی تاریکی اور اندھیرے سے تعبیر کرنے لگیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی کوششوں کے بارآور ہونے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر:

صبحیں جب سے رات ہوئی ہیں
جیون رُت کی باسی نظریں
منظر بجھتے تاروں کے

میلی روح کے اجڑے تن سے
جوت جگے پھر سانسوں کی
آدھی سوچ کے مالک اب تو
خالی آنکھ ہی واپس کر (۱۴)

سلیم شہزاد جدید شاعری کو اس کے خاص اسلوب و آہنگ سے ترتیب دینے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ موصوف صاحبِ طرز شاعر ہیں اور ان کا ڈکشن جدید نظم کے محضر نامے پہ موجود شعرا سے اس وجہ سے بھی مختلف ہے کہ انہوں نے روایتی اندازِ شاعری کو ترک کر کے نئے قالب میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ خاطر خواہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ نام ور ادیب اور کالم نگار انتظار حسین نے شاید انہی خصوصیات کی بنا پر سلیم شہزاد کو بہاول نگر کے ادبی منظر نامے پر ایک معتبر نام قرار دیاہے' وہ لکھتے ہیں:

"بہاول نگر کتنا مردم خیز خطہ ہے۔ کتنی عظیم شخصیتوں کو اس نے جنم دیا ہے اور کتنی اہم شخصیات اپنی نمود کے لیے بیتاب ہیں۔ خود سلیم شہزاد کو بھی ایسی ہی شخصیتوں میں شمار کرنا چاہیے۔ وہ جدید شاعر ہیں۔ بہاول نگر کی آبرو۔"(۱۵)

ان کی نظمیں جن مفاہیم و مطالب سے متصف ہیں ان کی قرأت کے لیے جو پیمانہ قاری کو سہولت بہم پہنچاتا ہے اس میں سب سے اہم کردار خود شاعر کا ہے کہ انہوں نے الفاظ کو ان کی مکمل بنّت اور مفہوم کے ساتھ اس طرح شعر کے قالب میں باندھا ہے کہ قاری کے لیے قرأت بقدر ضرورت سہل ہوئی ہے۔ راشد جمال فاروقی ان کی نظموں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''ابرار احمد کا خیال ہے کہ سلیم شہزاد کی شاعری میں جو ایک متلی(Nausea) والی کیفیت ہے وہ دو وجوہات سے ہے۔ایک تو زندگی کی کراہت آمیز لایعنیت اور دوسری پسماندہ طبقوں کی ذلت آمیز صورت حال۔ لہٰذا اس کی نظموں میں جبر و تشدد کے خلاف بھنچتی ہوئی مٹھیاں نظر آجاتی ہیں۔اس کی نظمین دانت پیستی ہاتھ ملتی اور غیر متوقع مناظر کو آنکھیں پھاڑے بد حواسی کے عالم میں دیکھتی ہیں۔زندگی کی لایعنیت کا روح فرسا ادراک اور بے بسی کا کرب، قسم ہے کفارے کی بیشتر نظموں سے ابل رہا ہے۔''(۱۶)

نظم ''تم چاہو جو فیصلہ کر لو'' مفہوم کے لحاظ سے تین حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہے۔ پہلے حصے میں سلیم شہزاد ضمیر فروشوں اور معاشرے کی کالی بھیڑوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود علاحدہ پہچان قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں، گویا وہ فیصلہ کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔

تم چاہو جو فیصلہ کر لو
سب اس سے انکاری ہیں
چاہو تو ضمیر بیچ دو
منصفی بیچتے رہو
خاموشیاں خرید لو(۱۷)

سلیم شہزاد کی نظموں کا خمیر ان کے معاشرے اور گردونواح سے اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ صاحبِ مشاہدہ شخص ہیں اور ہر چیز کے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد اپنے خاص انداز میں اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ گہری علامتی شکل اختیار کر جاتا ہے اور جب لفظوں کا روپ اختیار کرتا ہے تو مخصوص ڈکشن میں لکھی ہوئی نظم وجود میں آتی ہے۔ صلاح الدین حیدر لکھتے ہیں:

> "The words, similes, metaphors, mostly derived from the Punjabi folk tradition are simple and bright like a nebula in the milky way."(18)

نظم کے دوسرے حصہ میں وہ اپنی الگ پہچان بنانے اور خود کو برے لوگوں سے الگ کر کے اچھوں کی فہرست میں شامل کرنے کا جواز پیش کرتے ہیں اور اپنے لیے اچھائی کے راستے پر چلنے کی گویا ایک طرح سے راہ ہموار بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح نظام کے خلاف جانے والوں کو ان کی غلط روی کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ ذاتی طور پر دوسروں سے مکمل طور پر ممیز ہو جاتے ہیں۔

دکھ کی سانجھ بن کر
سکھ کو بانجھ کہتے رہو
اور پھر بھی یہ چاہو کہ
ہم چپ کی چاپ سنتے رہیں
تمہارے غلط فیصلوں پر
سر دھنتے رہیں(۱۹)

دنیا انسان کے بہترین تربیت گاہ ہے اور زندگی بہترین استاد۔ انسان اس تربیت گاہ میں ہر لمحہ خوب سے خوب تر کی کوشش میں ایک ایسے سفر پر گامزن جسے صرف اس کا فیصلہ ہی پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جب تک انسان میں قوتِ فیصلہ پیدا نہیں ہوتی وہ اچھائی اور برائی' نیکی اور بدی میں تمیز کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ سلیم شہزاد کی نظم ''تم چاہو جو فیصلہ کرلو'' اس حوالے سے قاری کو بہترین سبق آموز ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی خود کا راستہ متعین کرے' جیسے موصوف نے خود ذیل کے مصرعوں میں فیصلہ کیا ہے:

ہم جو زندگی بھر نہ کر سکے
اب کے وہی کام کرتے ہیں
تم ضمیر فروشی عام کرو
ہم سر فروشی عام کرتے ہیں(۲۰)

انسان کے لیے زندگی ہمیشہ دو راستے مہیا کرتی ہے۔ ایک راستہ وہ ہے جو اسے ہمیشہ جہالت اور تاریکی میں دھکیلتا چلا جاتا ہے' یہ دوغلی پالیسی ہے' جبکہ دوسرا راستہ یک رنگی ہے جو سراسر صاف اور بے باک ہے' اس کی انتہا بالخیر ہے۔ بقول علامہ محمد اقبال:

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو جا یا سنگ ہو جا (۲۱)

محبت محسوساتِ انسانی اور لطیف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اس کا اپنا ایک فارمیٹ ہوتا ہے یہ کسی خود ساختہ اصول کے تابع نہیں ہوتی اور اس کے لیے کسی قسم کے روایتی ضابطوں کی پابندی بھی ضروری نہیں ہوتی۔ سلیم شہزاد کی نظم ''محبت کا اپنا اک فارمیٹ ہوتا ہے'' میں ایسی ہی

منطقوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا تعلق محبت کے اندرونی محسوسات اور معاملات سے ہے۔ یہ مذہبی، نسلی اور طبقاتی قیود سے مبرا ہوتی ہے جن کے توا سل سے یہ اپنا الگ راستہ نکالتی ہے۔ سلیم شہزاد نے محبت کے اسی منفرد راستے کو لفظ "اپنا" لگا کر علیحدگی کی سند عطا کر دی ہے، جو ان کے نزدیک تاریخ کے جدلیاتی عمل سے مبرا نہیں ہو سکتی۔

محبت کا اپنا اک فارمیٹ ہوتا ہے
اس میں کلیشے نہیں چلتے
(یہ تاریخ کے جدلیاتی عمل سے بھی مبرا نہیں)
اس میں لفظوں کے پتنگے
سانسوں کی لَو پہ جلتے ہیں
راتوں کے عمیق گجرے
اُس کے ہاتھوں پہ جڑے ہیں
آنکھوں کی حِدّت
دن کے پچھواڑے سوکھتی ہے
تو دھوپ کی منڈیروں پہ رکھا
اک اک مسام بولتا ہے
اِس میں کلیشے نہیں چلتے (۲۲)

سلیم شہزاد کی نظموں میں خیر و شر کے تسلسل کا ایک واضح تصور یوں بھی ابھرتا ہے کہ وہ خود کو بطور منصف پیش کر کے صداقت کا پلڑا بھاری رکھتے ہیں۔ سلیم شہزاد کا مافی الضمیر اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ ہر لحظہ سچائی کے ساتھ کھڑے ہو کر نظام کو بدلنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنی ذات کو سچائی کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے وہاں وہ مورخین کو امانت کا بارِ گراں سونپ کر نصیحت کر رہے ہیں کہ اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ سچائی کو اس کے حقیقی انداز میں آنے والی نسلوں کے لیے رقم کر چھوڑیں تاکہ انہیں ہماری گزران اور قربانیوں کا پتا رہے۔ نظم کے چند مصرعے مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں:

وقت کے امین لوگو!
جاتے لمحوں کی داستان لکھنا
تو یہ بھی لکھنا
کہ بے چارگی ہم پہ ہنس رہی تھی

وقت کے امین لوگو

جاتے لمحوں کی داستان لکھنا

تو یہ بھی لکھنا

کہ ہمارے ذہن تجوریوں میں

سو رہے تھے

وقت کے امین لوگو

جاتے لمحوں کی داستان لکھنا

تو یہ بھی لکھنا

کہ ہمارے دلعزیز چہرے

سولیوں پہ لٹک رہے تھے (۲۳)

کسی معاشرے کا شاعر یا ادیب ایک طرح سے اپنے وقت کا مؤرخ بھی ہوتا ہے جو اپنے مشاہدات کے ذریعے تصاویر بناتا ہے انہیں لفظی پیراہن عطا کرتا چلا جاتا ہے جو آنے والی نسلوں کے نایاب دستاویزات کا کام کرتی ہیں۔ سلیم شہزاد اپنے دور کا نہ صرف شاعر بلکہ مؤرخ ہے' جو تمام تر حالات کو مشاہدات کے ذریعے لفظی لبادے اوڑھا کر ایک تاریخ رقم کر رہا ہے۔ سلیم شہزاد کی نظمیں آئندہ نسل کے لیے اس لیے بھی اہم ہوں گی کہ وہ گذشتہ نسل کے تجربات اور ماضی کے تلخ و شیریں حالات سے آشنائی حاصل کر سکے گی۔

شاعر معاشرے کا حساس ترین عنصر ہوتا ہے جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنے جسم میں بعینہٖ محسوس کرتا ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ سلیم شہزاد کی نظم "وقت کے امین لوگو" اس کی واضح مثال ہے جس میں وہ عصرِ حاضر میں ہونے دھماکوں اور بم بلاسٹ کے آئے روز ہونے والے واقعات کو بڑے شستہ انداز میں بیان کر گئے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

وقت کے امین لوگو

جاتے لمحوں کی داستان لکھنا

تو یہ بھی لکھنا

کہ لفظ ہماری زبانوں سے لوچ لئے گئے تھے

وقت کے امین لوگو

یہ ضرور لکھنا کہ ہمارے

سر بریدہ جسموں سے

بارود کا دھواں اٹھ رہا تھا (۲۴)

"دو رُتوں کی ایک نظم" دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں سلیم شہزاد اپنے آباء کے ماضی میں سانس لیتے ہیں اور ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے ہیں۔ گذشتہ رُت کی آنکھوں سے میلے شہروں کا نظارہ کرنا اصل میں اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کا باطن ماضی میں اس قدر کھُب چکا ہے کہ وہ وہیں بیٹھ کر گزرتے لمحوں کا نظارہ کرتا ہے' گویا یوں کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ سلیم شہزاد نظم کے پہلے حصے میں ماضی پرستی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

جاتی رت کی آنکھوں میں

سوچ کے میلے شہروں کا

اک اک منظر گھوم رہا تھا (۲۵)

سلیم شہزاد کی عطایہ ہے کہ ان کا مستقبل کی تابندگی کا خواب ان کی ماضی پرستی سے پھوٹتا ہے۔ وہ اقبال کی طرح نہ تو مستقل طور پر شاندار ماضی کے پرستار رہے ہیں کہ ان کے مستقبل کی امید ہی ختم ہو جائے اور نہ ہی وہ راشدؔ کی طرح مستقبل کے پجاری رہے ہیں کہ ان کا تعلق ماضی اور تاریخ سے کٹ کر رہ جائے بلکہ ان کا انداز نہایت ہی شاندار ہے کہ وہ دونوں کے درمیان سے امید اور رجائیت یعنی مستقبل کی جانب سفر کی ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں۔ مثلاً:

آتی رُت کے آنگن میں

روگی چاند کا پاگل پن

جانے کیا کیا سوچ رہا تھا (۲۶)

سلیم شہزاد کی اکثر نظمیں رومانویت کے زیرِ اثر لکھی گئی ہیں اور ان کی خیال آفرینی کا سرچشمہ ماضی کی یادوں سے پھوٹتا ہے۔ انہوں نے خیال پروری کا بنیادی تصور ماضی سے حاصل کیا اور اسی یوٹوپیائی کائنات میں سے مسرتوں کے پل تلاشے ہیں۔ ان کے ہاں جہاں علامتیں خاص اہمیت کی حامل ہیں وہیں گذشتہ زندگی خصوصاً بچپن اور اس کے واقعات مع خواہشاتِ کامل و نامکمل بھی ان کی افتادِ طبع کی نقیب ہیں۔ ذیل میں "نظم ٹوٹ جاتی ہے" ملاحظہ ہو:

کبھی نظموں نے پھول پہنے تھے، کبھی نظموں سے باس آتی، کبھی نظموں کی آنکھوں

پہ تتلیاں بیٹھ جاتیں، کبھی نظمیں روٹھ جاتی، کبھی پاس آتی تھیں،

کبھی نظموں کی راکھ سے مشعلیں بناتے تھے، کبھی موسموں کی آس

پہ گھروندے بیٹھ جاتے' اب نظموں کی چاپ پہ رات جھینپ جاتی ہے

اور

رات ہی رات میں نظم ٹوٹ جاتی ہے (۲۷)

''نظم ٹوٹ جاتی ہے''میں سلیم شہزاد نے لفظ''نظم''کو کثیر الجہاتی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ایک طرف تو وہ ایک سلسلہ اور کڑی کے معنی دیتی ہے جو بچپن سے لے کر موجود تک محیط ہے جبکہ اس لفظ کی دوسری جہت یادوں کے معنی دیتی ہے۔اس نظم میں سلیم شہزاد کی زندگی بڑی حد تک واضح ہو کر دکھائی دیتی ہے'یعنی ایک وقت تھا جب وہ بچپن میں زندگی کے الجھیڑوں اور پریشانیوں سے ناواقف خوشیوں کے سمندر میں غوطہ زن تھے اور مختلف خواہشات کے پورے ہونے پر اس کی آنکھوں میں ممنونیت جاگ اٹھتی تھی جس کو انہوں نے آنکھوں پر تتلیاں بیٹھ جانے سے تعبیر کیا ہے۔

سلیم شہزاد کی نظم نگاری کا فنی پیرائیہ بعض نقاد کے ہاں ان کے فکری اور خیالاتی اظہار سے کہیں بڑھ کر ہے۔انہوں نے نظموں کی ظاہری بنت کو اہمیت دیتے ہوئے پہلا اظہار اسی پر کیا ہے' جبکہ بہت سے نقاد کے ہاں ان کی فکری اور استدلالی داخلیت زیادہ اہم ہے۔ان کی نظموں میں فنی لحاظ سے ہیئتوں کے تجربات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے ڈاکٹر مزمل حسین لکھتے ہیں:

''سلیم شہزاد نے اپنی نظم میں ہیئتوں کے مختلف تجربات کر کے ایک انفرادیت پیدا کی ہے۔''(۲۸)

اسی طرح اگلے مصرعوں میں وہ خواہشات کے پورے نہ ہونے پر ان کی راکھ سے مشعلیں بناتا ہے اور اب جب کہ خود اس سطح پہ کھڑا ہے کہ جہاں اسے اپنے ہی بچوں کی خواہشات کو پورا کرنا پڑتا ہے تو اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے اور وہ اس میں جو سکون اور تسکین محسوس کرتے ہیں وہ رات کی تنہائی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے 'گویا نظم ٹوٹ جاتی ہے۔رشتے خون کے ہوتے ہیں یا احساس کے'لیکن زیرِ تجزیہ نظم میں سلیم شہزاد نے جن رشتوں کا ذکر کیا ہے اُنھیں بے جوڑ قرار دیا ہے کیونکہ وہ جذبات کے رشتے ہیں جن کے ساتھ تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے ہیں اور بامِ عروج تک جا پہنچتے ہیں لیکن اس قدر گہرائی اور پختہ کاری کے باوجود ان کی وضاحت کرنا محال ہوتا ہے کہ یہ میرے لیے کیسا رشتہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں شاعر نے بے جوڑ رشتوں کا نام دیا ہے۔زمانہ ایسے رشتوں کا دشمن ہوتا ہے وہ انہیں کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرتا اسی مجبوری کے سبب سلیم شہزاد بے جوڑ رشتوں کا جواز تلاش کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ نظم دیکھیے:

تم نہیں جانتے

بے جوڑ رشتوں کا دکھ کیا ہے

ہم روز

بے جواز رشتوں کا

جواز ڈھونڈتے ہیں

پھر احتیاط کی سیڑھیاں

چڑھتے چڑھتے

بے اختیار ہو جاتے ہیں (۲۹)

'نیند کی گولیاں تلاشنا' اصل میں سکون پانے کے لیے کی جانے والی کوشش کا استعارہ ہے۔ جب اس کوشش میں ناکام ہونے لگتے ہیں تو بے خوابی مقدر بن جاتی ہے اور سوچوں کا تانتا اس قدر بندھتا ہے کہ اس کی رسائی بام فلک تک ہونے لگتی ہے۔ یہاں نظم کے آخری مصرعوں میں بے جوڑ رشتوں کی اختتام پذیری مشکوک دکھائی گئی ہے۔ نظم میں تسلسل اسی ترتیب سے قائم ہے جس طرح ان رشتوں کی شروعات ہوتی ہے 'عروج ہوتا ہے' احساسِ تشکک پیدا ہوتا ہے اور پھر رشتے بے نام ہو کر مر جاتے ہیں لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ ان رشتوں کی اسی نوعیت کا نام انہوں نے بے جوڑ رکھا ہے۔

نیند کی گولیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

بے خواب ہو جاتے ہیں

سوچ کی سوئی میں

دھاگے پروتے پروتے

عمریں گزار دیتے ہیں

احساس کی آنچ پہ

پکتے رہتے ہیں (۳۰)

نظم کے آخری حصے میں ہجر کی سزا کا ذکر ملتا ہے کہ مخلص رشتہ کا حامل زندگی بھر گزرے لمحات کے احساس کا قیدی بنا رہتا ہے اور جس کی یادوں کو کبھی ذہن میں نہیں لانا چاہتا اسی یادوں کے سہارے زندگی جیتا ہے۔ بقول حسرت موہانی:

ے بھلاتا لاکھ ہوں مگر برابر یاد آتے ہیں

الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں (۳۱)

سلیم شہزاد نے بھی اسی کیفیت نظم کی ہیئت میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں نہ صرف ہجر کی کیفیات کا ذکر ملتا ہے بلکہ وہ اپنی بات کو اسی نکتہ پالا کر ختم کرتے ہیں جہاں سے اسے شروع کیا تھا' یعنی رشتوں کے آغاز سے لے کر اختتام تک ان کی تلاش پوری نہیں ہو سکی اور وہ

ابھی بھی بے جوڑ رشتوں کا جواز تلاش کرنے اور پھر اس محرومی کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دکھ تک کی وضاحت کرتے ہیں۔ نظم سے اقتباس ملاحظہ ہو:

جسے دیکھنا نہ چاہیں
اسے تکتے رہتے ہیں
جسے بھولنا نہ چاہیں
اس سے روٹھ جاتے ہیں
تم نہیں جانتے
بے جوڑ رشتوں کا
دکھ کیا ہے
ہاں تم نہیں جانتے (۳۲)

انسانوں کے آپس میں مختلف نوعیت کے بندھن ہیں' یہ بندھن' رشتے' تعلقات' چاہے خونی ہوں یا احساس کے' ہر دو سطح پر رشتوں کی جُڑت میں ضروریات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا خاصا ہے کہ تمام انسانوں اپنے ماحول اور اس میں رہنے والے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے زیر تجزیہ نظم "ضرورت جوڑ دیتی ہے" میں سلیم شہزاد رقم طراز ہیں:

ہم خود نہیں جڑتے' ضرورت جوڑ دیتی ہے
اور کبھی
مجبوری کے پاؤں پہ
خود سے جڑنا پڑتا ہے
کہ احتیاج کی لَو_ کبھی تیز' کبھی مدھم' کبھی مدھم' کبھی تیز
ہو جاتی ہے (۳۳)

سلیم شہزاد جب انسانی جذبات اور کیفیات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ انہی کیفیات و جذبات کی سطح پہ اتر آتے ہیں' بلکہ انہی کیفیات سے دوچار ہو کر لکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم صاحبِ ذوق قاری کے دل و دماغ کو اس قدر اپنے حصار میں لے لیتی ہے کہ وہ اپنے مفاہیم و مطالب کی مکمل جاذبیت سمیت اس پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہے جس سے قاری کی حسِ احساس اور دلی گداز یکجائیت اختیار کر جاتے ہیں۔

ہم
انکار کے انگاروں پر چل نہیں سکتے
محبت'
ہار جاتے ہیں   (۳۴)

جس طرح احتیاج' افلاس اور ضروریات کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اسی انسانوں' ضروریات اور رشتوں کا بھی آپس میں لازم وملزوم کا تعلق ہے۔ انسانوں کے تعلقات یا تو ضروریات کے پیش نظر پروان چڑھتے ہیں یا پھر حصولِ زر و دولت کی بنا پر۔ رشتوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کسی بھی سطح پر انسانی جذبات اور احساسِ ہمدردی یا تکریم و تحریم کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ لفظوں کی بھی آبرو ہوتی ہے اور جب ان کا بے محل استعمال کیا جاتا ہے تو ان کی آبرو نہیں رہتی۔

سلیم شہزاد بھی لفظوں کی آبرو کو گنوانے کی بجائے ان کے بر محل استعمال سے ان کی توقیر دگنی کرنے کی ترکیب کرتے ہیں یعنی وہ ریاکاری کے سبب پورے عمل کو برباد ہوتے دیکھتے ہیں تو معاً لفظوں کی اس بے حرمتی اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی نوحہ خوانی پر ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ وہ مضموم صداؤں کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے محلات میں ضم ہونے اور احساس کی چکی میں پسنے کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو اس مشاہدہ کو اس طرح نظم کا حصہ بناتے ہیں' کہ پرولتاری کی صدائے بے نوا کو معنی خیزی دینے کی سعی کرتے ہیں۔ نظم دیکھیے:

لفظ پوروں کی ریاکاری پہ سر رکھے
سوچتے ہیں
حرف' احساس کی چکی میں
پستے پستے
مضموم صداؤں کے
محلّات میں
ٹھہر جاتے ہیں
قوسوں کی طغیانی سے
جذبے جاگ اٹھتے ہیں
نظم بول پڑتی ہے   (۳۵)

سلیم شہزاد کے ہاں نظم کثیر المعنوی جہات کا حامل لفظ ہے۔ وہ جہاں نظم کو بطور صنفِ شاعری استعمال میں لاتے ہیں وہیں ان کے ہاں نظم زندگی' ترتیب' آہنگ اور دیگر کئی معانی کی جگہ بھی لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کے عمل جب ریاکاری کا شکار ہوتے ہیں تو اپنی تاثیر کھو دیتے

ہیں، اور جب انہیں پوروں کی نذر کر کے گنتی کی حد میں محدود کر دیا جاتا ہے تو گویا حروف کی تقدیس ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعر ان کو محلات کے دیوار و در میں مضموم ہوتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ سنڈے میگزین کے تبصرے کے مطابق:

''سلیم شہزاد نے نظم کی سطروں کے چھوٹے یا بڑے ہونے کو تو نظم میں احساس کے جزو و مد کے تابع رکھا ہے مگر انہیں کاغذ پر لکھتے ہوئے کاغذ کی سپیس کا انوکھا، فن کارانہ استعمال کیا گیا ہے۔''(۳۶)

شاعری تخلیق کار کے قلب و ذہن کا خمیر ہوتا ہے۔ تخلیق کار جن حالات میں رہ رہا ہوتا ہے وہ ان کا ذکر دانستہ یا نادانستہ اپنے کلام یا بیان میں کسی نہ کسی طرح کر جاتا ہے۔ نظم ''میں سمجھتا ہوں'' بھی اسی نوعیت کا نقشہ کھینچتی ہے کہ جس سے شاعر کی ذاتی زندگی اور معاملات و معمولات کی ایک جھلک قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ ذاتی مسائل اور مجبوریاں تو ہر انسان کی زندگی کا لازمی جزو ہیں، لیکن اگر نظم کو مد نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے بحیثیت شاعر سلیم شہزاد اپنی زندگی کے حالات اور معاشرے کی عکاسی کی یکجائیت بیان کرتے ہیں کیونکہ اپنائیت کی دلدل میں کھڑا شخص جو دوستوں کی دشمنیوں کو اپنی آنکھوں دیکھ رہا ہو، لیکن وہ اس کا سدباب نہ کر سکتا ہو، یا نہ کرنا چاہتا ہو تو میرے خیال میں اس کی مفاہمت پسندی کی بہترین مثال ہے۔ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

میں گردموسموں کے
سرد لہجوں کی
بات نہیں کرتا
غنیم جاں کی
مجبوریاں سمجھتا ہوں
میں اپنائیت کی
دلدل میں کھڑا
دوستوں کی
دشمنیاں سمجھتا ہوں (۳۷)

حریم ناز کے اجالوں کو اپنی دسترس میں نہ پانا میرے خیال میں سلیم شہزاد کی ذاتی زندگی سے جڑے کسی واقعہ کی عکاسی ہی ہے اور نظم میں اکثر مصرعے اسی بات کے غماز ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں سلیم شہزاد اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ماحول سے لاتعلقی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے گردو پیش سے بے خبر ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتوں کو نبھانے کی بھرپور کوشش میں سرگرداں ہیں۔ نظم کا اگلا حصہ ملاحظہ ہو:

سمجھتا ہوں کہ

حریم ناز کے اجالے

میری دسترس میں نہیں

میں دوریوں کے

گوشوں میں پڑا

مجبوریوں کے

پر کاٹ رہا ہوں

تم سمجھتے ہو

کہ میں سمجھتا ہی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ میں

بھنور کاٹ رہا ہوں (۳۸)

سلیم شہزاد کی نظموں کا مرکز اور محور انسان، انسانی ذات، انسانی مسائل و مصائب یا ذات اور انائے ذات ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جو آفاقی ہیں گویا سلیم شہزاد نظم میں جو پیرایۂ اظہار اپنائے بیٹھے ہیں وہ دنیا بھر کے لوگوں اور ان کے حالات، کیفیات، مسائل وغیرہ کو اپنے حصار میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب سے دنیا مادیت پرستی کی طرف سفر کرنے لگی ہے تب سے انسان بے چہرہ ہونا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے انسان کو اصلی چہرا اکھر درا اور بھیانک دکھائی دیتا ہے۔ سلیم شہزاد کی نظموں میں بیان ہونے والا انسان اسی وجہ سے اپنا اصلی چہرہ لیے کھڑا ہے کہ شاعر نے اس کے اس کی اصلی حالت اور نقشے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جب انسان ہی بدگمانی کا سہارا لینے لگیں تو شہر آزار بلاشبہ زندگی کی تلاش میں سڑکوں کا طواف کرتے ہوئے فٹ پاتھ پہ جم جائیں گے۔

سنا ہے شہر آزار

تم زندگی ڈھونڈ رہے ہو

اور معانی کے فٹ پاتھ

الفاظ کے اجسام کی ہمراہی میں

بدگمانی کی سڑکوں کا

طواف کر رہے ہیں (۳۹)

سلیم شہزاد کی نظموں میں بیان کیا گیا انسان اپنی ظاہری شان وشوکت اور عزت وعظمت پر متبسم ومتمکن نظر آتا ہے حالانکہ اس کی تطہیر اور اصل منصب تو وہ ہے جس تک اسے کبھی رسائی ہی نہ ہو سکی بلکہ وہ کبھی اپنے اصل منصب رسائی حاصل کرنے کے لیے کبھی کوشاں ہی نہ ہوا ہو گا۔ سلیم شہزاد اپنے قاری کو عصرِ نو کے انسان کے مسائل اور اس کی داخلی منصب کی اصلیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ مثال دیکھیے:

سنا ہے منصب کی تصویر
شہری کی تطہیر پہ ہنس رہی ہے
اور پوریں مطالب کے جنگل کی
راہ پکڑ رہی ہیں (۴۰)

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی خوب صورتی ہوتی ہے' وقت کی خوب صورتی یہ ہے کہ اسے صحیح انداز میں بر محل استعمال میں لایا جائے۔ اگر صحیح وقت پر کوئی کام انجام نہ پائے تو اس کا سارا حسن قبح میں بدل جاتا ہے۔ سلیم شہزاد وقت پر کام کرنے کا ایک استعمال یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ رشتوں کو نبھانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے لیکن اگر ان میں کسی قسم کی کوئی دراڑ پیدا ہونے لگے تو اسے وقت کے بعد سیمنٹ سے بھرنے کا کوئی فائدہ نہیں' کیونکہ وقت کے سفر میں رکاوٹ نہیں ہے۔

نظم ''لمحے ٹوٹ جاتے ہیں'' میں سلیم شہزاد اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

رشتوں کی فصیل میں
دراڑیں پڑتی ہیں
تو لمحوں کے
سیمنٹ سے بھرنا بھی چاہیں
تو بھر نہیں سکتے (۴۱)

ایک نظم میں سلیم شہزاد نے احمد خان سے مکالمہ کرتے ہوئے اسے کہا ہے کہ تمہارے شہر میں ٹراؤزر بکتے ہیں لیکن کتابیں نہیں بکتیں۔ ٹراؤزرز کے بکنے سے تجارت اور سامانِ تجارت کی فراوانی مراد ہے جبکہ کتب کا نہ بکنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہاں علم اور تعلیم کا فقدان ہے۔ احمد خان اگر ایک فرضی نام ہے تو پھر اس کی دنیا بھی فرضی ہے' یعنی احمد خان کے شہر سے میرے اپنے ہی ملک کا کوئی شہر ہو سکتا ہے۔ جس میں تجارت تو اپنے عروج کو پہنچی ہوئی ہے لیکن علم کی طرف آج بھی لوگوں کی توجہ اس نوعیت کی نہیں ہے جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔

سلیم شہزاد کی نظموں میں گہری علامات اور استعارے موجود ہیں جو ان کی فکری بالیدگی اور ذہنی ارتقا کی دلیل ہیں۔ سلیم شہزاد جہاں علامتوں کے استعمال کے ساتھ انصاف برتتے ہیں وہاں وہ اس کی معنی خیزی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ خزاں کو ہوا کی سپردگی پہ لہرنے کی بات

اس وجہ سے کرتے ہیں کہ گویا خزاں برے وقت کی علامت ہے اور ہوا کا بہاؤ ہر لحظہ موجود ہے' یعنی بالفاظ دیگر یوں کہنا بڑی حد تک مناسب ہو گا کہ جو بھی کام کرنا ہو وہ اپنے معینہ وقت پر کر لینا چاہیے کیونکہ برے وقت کی آمد کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ سلیم شہزاد کی نظمیں ماضی اور مستقبل کے واقعات اور حالات کا خوب صورت امتزاج پیش کرتی ہیں۔ جہاں وہ ماضی کے ناگفتہ بہ حالات پہ نوحہ کناں ہوتے ہیں تو وہیں وہ مستقبل میں اس کا حل بھی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ نظم "غنیمِ شب" سے پیدا ہونے والے خیال کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ غنیمِ شب کا لفظ سلیم شہزاد نے حکمرانوں کی نمائندگی کے لیے برتا ہے۔

سلیم شہزاد کی نظمیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی بھی پہلو وہ چاہے انسان سے متعلق ہو یا اس کے احساس سے 'زندگی کا حصہ ہو یا مابعد الطبیعاتی' وہ حتیٰ الوسع اسے شعری رنگ دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک شاعر یا ادیب اپنے معاشرے کا سب سے حساس رکن ہوتا ہے اور جن چیزوں پر اس کی نظر ہوتی وہ عام لوگوں کا حدفِ نظر نہیں ہوتیں۔ ایک اچھے شاعر کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں دیکھے اور اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر اسے تمثیلی یا حقیقی روپ میں ایسا پیرائیہ مہیا کرے جو اس کے لیے مناسبت رکھتا ہو۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم شہزاد'ماسوا(کراچی: تشکیل پبلشرز'۱۹۹۸ء)ص:۴۱

۲۔صلاح الدین حیدر'مکتوب بنام سلیم شہزاد'صحرا کے پرندے کی پرواز پر ایک نظر'۲۱۰جناح کالونی'بہاول نگر'۲۰۱۷ء

۳۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۴۳

۴۔مزمل حسین'ڈاکٹر'سلیم شہزاد کے شعری اسالیب پر ایک نظر'مشمولہ:روزنامہ خبریں'لاہور'۱۰اپریل'۲۰۰۹ء

۵۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۴۵

۶۔ایضاً'ص:۴۵

۷۔صلاح الدین حیدر'مکتوب بنام سلیم شہزاد'صحرا کے پرندے کی پرواز پر ایک نظر'۲۱۰جناح کالونی'بہاول نگر'۲۰۱۷ء

8. Salah-ud-Din Haider, Book Review,Monthly Shining path,July,2007

۹۔فاروق ندیم'ماسوا'مشمولہ:ہفت روزہ پاکستان پوسٹ'(لندن:نیویارک'ٹرنٹو'۲۰۰۱ء)

۱۰۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۴۷

۱۱۔انتظار حسین'جالندھر'بہاول نگر'نیز جدید شاعری'مشمولہ:روزنامہ ایکسپریس'۲اپریل'۲۰۱۲ء

۱۲۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۴۷

۱۳۔فاروق ندیم'ماسوا'مشمولہ:ہفت روزہ پاکستان پوسٹ'۲۰۰۱ء

۱۴۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۴۹

۱۵۔انتظار حسین'جالندھر'بہاول نگر'نیز جدید شاعری'مشمولہ:روزنامہ ایکسپریس'۲اپریل'۲۰۱۲ء

۱۶۔راشد جمال فاروقی'روشنی کی راکھ جلتی ہے'مشمولہ:ادبیات(انڈیا)'جولائی ۲۰۱۰ء'ص:۴۷

۱۷۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۵۳

18. Salah-ud-Din Haider, Book Review,Monthly Shining path,July,2007

۱۹۔ سلیم شہزاد'ماسوا'ص:۵۳

۲۰۔ایضاً'ص:۵۳

۲۱۔ اقبال، کلیات اقبال (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء) ص:۱۷۷
۲۲۔ سلیم شہزاد، ماسوا، ص:۵۴
۲۳۔ ایضاً، ص:۵۵
۲۴۔ ایضاً، ص:۵۵۔۵۶
۲۵۔ ایضاً، ص:۵۷
۲۶۔ ایضاً، ص:۵۷
۲۷۔ ایضاً، ص:۵۸
۲۸۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، سلیم شہزاد کے شعری اسالیب پر ایک نظر، مشمولہ: روزنامہ خبریں، لاہور، ۱۰ اپریل، ۲۰۰۹ء
۲۹۔ سلیم شہزاد، ماسوا، ص:۶۲
۳۰۔ ایضاً، ص:۶۲
۳۱۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت موہانی (کراچی: تشکیل پبلشرز، ۱۹۸۳ء)
۳۲۔ سلیم شہزاد، ماسوا، ص:۶۲
۳۳۔ ایضاً، ص:۶۳
۳۴۔ ایضاً، ص:۶۳
۳۵۔ ایضاً، ص:۶۴
۳۶۔ وقت، سنڈے میگزین، ۱۷ مئی، ۲۰۰۹ء
۳۷۔ سلیم شہزاد، ماسوا، ص:۶۶
۳۸۔ ایضاً، ص:۶۶
۳۹۔ ایضاً، ص:۶۷
۴۰۔ ایضاً، ص:۶۷
۴۱۔ ایضاً، ص:۶۸